ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2955

Program: BS (Islamic Studies)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(شعبہ شریعہ، کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ)

کورس: مباحث فقہی معاصر (2955) • سطح: بی ایس (علوم اسلامیہ)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ 5 تا 9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 0

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

کورس کا تعارف اور اس مشق کا جائزہ

امتحانی مشق نمبر 2 یونٹ 5 تا 9 پر مشتمل ہے اور اس کے پانچ سوالات خاندانی قانون، حقوق معنویہ، انشورنس، حدود و قصاص میں ثبوت کے اصول اور نظام عدل کے اداروں سے متعلق ہیں۔ یہ سوالات اس لیے اہم ہیں کہ ان میں فقہ کے کلاسیکی اختلافات کے ساتھ ساتھ جدید قانونی و معاشی صورت حال بھی پیش نظر رہتی ہے۔ اس گائیڈ میں ہر

جواب کو تعارف، ذیلی عنوانات، تقابلی جداول اور خلاصے کے ساتھ منظم کیا گیا ہے۔ حدود و قصاص جیسے موضوعات خالص تعلیمی مطالعہ کے طور پر پیش کیے گئے ہیں؛ ان کا اطلاق عدالتوں اور مجاز قانونی اداروں ہی کا کام ہے۔

سوال نمبر 1: بالغ عاقل عورت کے نکاح میں ولی کی ضرورت — احناف و ائمہ ثلاثہ کا موقف (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔ احناف اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بالغ اور عاقل عورت کے نکاح میں ولی کی ضرورت کے بارے میں فرق بیان کریں۔ اس میں ولایت اجبار اور ولایت استحباب کی تفصیل بھی شامل کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

نکاح اسلام میں محض ایک ذاتی معاملہ نہیں بلکہ ایک سماجی ادارہ ہے جس سے دو خاندان جڑتے ہیں اور نسل و معاشرے کے بہت سے حقوق وابستہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے شریعت نے نکاح کے ارکان و شرائط میں خاص احتیاط برتی ہے، اور انہی شرائط میں سے ایک بحث نکاح میں ولی کی حیثیت کی ہے۔ ولی سے مراد عورت کا وہ قریبی رشتہ دار، عام طور پر والد یا اس کے قائم مقام عصبہ، ہے جو اس کی سرپرستی کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر عورت بالغ اور عاقل ہو تو کیا وہ اپنا نکاح خود کر سکتی ہے یا ولی کی اجازت و شمولیت لازم ہے۔ اس مسئلے میں فقہاء کے دو معروف موقف ہیں: احناف کا موقف اور ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کا موقف۔ اس سوال میں پہلے ولایت کی اقسام، پھر دونوں موقفوں کے دلائل، پھر ان کے درمیان فرق کی عملی صورتیں اور آخر میں جدید قانونی صورت حال کا تعلیمی جائزہ پیش کیا جائے گا۔ یہ بحث بھی خالص علمی مطالعہ ہے؛ کسی عملی معاملے میں فریقین کو اہل علم اور قانون کی رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔

ولایت کی اقسام: اجبار، استحباب اور دیگر تقسیمات

ولایت کی سب سے اہم تقسیم ولایت اجبار اور ولایت استحباب یا اختیار کی ہے۔ ولایت اجبار سے مراد وہ ولایت ہے جس میں ولی کو نابالغ یا کم عقل شخص کا نکاح اس کی رضا کے بغیر بھی کرنے کا اختیار حاصل ہو، کیونکہ ایسا شخص خود اپنے مفاد کی حفاظت کی پوری اہلیت نہیں رکھتا۔ اس ولایت کا اصل دائرہ نابالغ بچے اور بچی اور بعض خاص حالتیں ہیں، اور اس میں بھی ولی کے لیے خیر خواہی، کفو یعنی مناسب رشتے کا لحاظ اور مہر مثل کی ولایت جیسی شرائط بعض فقہاء نے مقرر کی ہیں۔ ولایت استحباب سے مراد وہ صورت ہے جہاں اصل اختیار خود اس شخص کو حاصل ہو جس کا نکاح ہو رہا ہے، لیکن ولی کی شمولیت مستحب یا شرائط میں شامل سمجھی جائے، یا بالغہ کے معاملے میں ولی کی رضا کو نکاح کی تکمیل و شایستگی کے لیے اہم قرار دیا جائے۔ اس کے علاوہ فقہاء نے ولایت کو خاص و عام اور قریب و بعید یعنی نزدیک اور دور کے ولی کی ترتیب میں بھی تقسیم کیا ہے: ولی اقرب موجود ہو تو دور والے کو ولایت حاصل نہیں ہوتی، اور ولی کی ترتیب عصبہ کی ترتیب کے مطابق ہوتی ہے۔ بالغہ کے نکاح کی بحث عام طور پر یہیں سے شروع ہوتی ہے کہ اس کی ولایت اجبار ہے یا استحباب، یا اسے اپنا نکاح کرنے کا مکمل اختیار ہے۔

احناف کا موقف

احناف کے نزدیک بالغ اور عاقل عورت کو اپنا نکاح خود کرنے کا اختیار حاصل ہے، بشرطیکہ نکاح کفو یعنی برابری کے رشتے میں ہو اور مہر مثل سے کم مہر پر نہ ہو۔ ان کی دلیل کی بنیاد یہ ہے کہ بالغ عاقل انسان اپنے مال میں تصرف کی مکمل اہلیت رکھتا ہے، تو اپنی ذات کے معاملے میں بھی اسے اختیار ہونا چاہیے، اور روایات میں بالغہ عورت کی رضامندی کو نکاح کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اس اختیار کے ساتھ احناف نے دو پابندیاں بھی لگائی ہیں جو اس موقف کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں: ایک یہ کہ اگر بالغہ غیر کفو میں نکاح کرے تو ولی کو عدالت سے اس نکاح پر اعتراض اور جدائی کا حق حاصل ہوتا ہے، کیونکہ کفو خاندانی عزت اور رشتے کی ہم آہنگی سے متعلق حق سمجھا گیا ہے جس میں ولی بھی شریک ہے۔ دوسری یہ کہ اگر مہر، مہر مثل سے نمایاں طور پر کم رکھا جائے تو ولی اعتراض کر سکتا ہے کہ مہر مثل تک پورا کرایا جائے یا نکاح ختم کرایا جائے۔ اس طرح احناف کے نزدیک ولی کی

رضا نکاح کے انعقاد کی شرط نہیں، لیکن ولی مکمل طور پر غیر متعلق بھی نہیں؛ اسے خاص نقصان کی صورت میں قانونی چارہ جوئی کا حق حاصل ہے۔ شادی میں ولی کی شمولیت اور اس کی رضا کو احناف بھی پسندیدہ اور خاندانی ہم آہنگی کے لیے بہتر سمجھتے ہیں، فرق صرف قانونی حیثیت کا ہے۔

ائمہ ثلاثہ کا موقف

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک نکاح میں ولی شرط ہے؛ بالغ و عاقل عورت بھی ولی کے بغیر اپنا نکاح نہیں کر سکتی۔ اس موقف کی معروف دلیل وہ حدیث ہے جس کا مفہوم ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں، اور وہ روایات جن میں ولی کی اجازت کے بغیر ہونے والے نکاح کو باطل قرار دیا گیا ہے۔ ان ائمہ کے نزدیک نکاح ایسا سنگین معاہدہ ہے جس کے نتائج نسل، خاندان اور مستقبل کی نسلوں تک جاتے ہیں، اس لیے خاندان کے سرپرست کی نگرانی اور تجربہ اس میں شامل ہونا چاہیے۔ البتہ ان کے نزدیک بھی ولی ظالم نہیں ہو سکتا: اگر ولی بغیر کسی معقول وجہ کے بالغہ کے مناسب رشتے میں رکاوٹ ڈالے، جسے عضل کہا جاتا ہے، تو ولایت قاضی یا عدالت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور عدالت نکاح کرا سکتی ہے۔ اسی طرح بالغہ کی رضا ان ائمہ کے نزدیک بھی بنیادی اہمیت رکھتی ہے؛ کنواری سے اجازت اور ثیبہ یعنی شادی شدہ رہ چکی عورت سے صریح رضامندی لی جاتی ہے، اور زبردستی نکاح کو درست نہیں سمجھا جاتا۔ فرق صرف اس نکتے میں ہے کہ رضا کے ساتھ ولی کا عمل دخل بطور شرط شامل ہے، خواہ وہ باپ ہو یا قریبی ولی، اور اس کی غیر موجودگی میں قاضی اس کا قائم مقام بنتا ہے۔

جدول 1: بالغ و عاقل عورت کے نکاح میں ولی کے بارے میں موقفوں کا موازنہ

پہلو	احناف	ائمہ ثلاثہ
ولی کی حیثیت	انعقاد کی شرط نہیں؛ عورت خود نکاح کر سکتی ہے	ولی نکاح کی شرط ہے
کفو کی شرط	غیر کفو میں ولی کو اعتراض و عدالت کا حق	ولی خود دیکھتا ہے؛ کفو کا لحاظ ولایت ہی سے ہوتا ہے
مہر مثل سے کمی	ولی کو اعتراض کا حق حاصل ہے	ولی کی شمولیت سے معاملہ طے ہوتا ہے

ولایت قاضی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے (عضل کی صورت)	عورت اپنے اختیار سے نکاح کر سکتی ہے	ولی کی بے جا رکاوٹ
بنیادی شرط؛ کنواری کی اجازت، ثیب کی صریح رضا	بنیادی شرط	عورت کی رضا

فرق کی عملی صورتیں اور آج کا قانونی پس منظر

اس اختلاف کا عملی اثر چند صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ پہلی صورت وہ ہے جہاں بالغ لڑکی نے ولی کو شامل کیے بغیر نکاح کر لیا ہو: احناف کے اصول پر یہ نکاح اصولاً منعقد ہو جائے گا بشرطیکہ کفو اور مہر کی شرائط پوری ہوں، جبکہ ائمہ ثلاثہ کے اصول پر یہ نکاح درست نہیں ہو گا کیونکہ شرط مفقود ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جہاں ولی معقول وجہ کے بغیر ہر رشتہ رد کر رہا ہو: دونوں طرف اس کا حل موجود ہے، احناف کے نزدیک لڑکی اپنے اختیار سے شادی کر سکتی ہے اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک عدالت ولایت سنبھال لیتی ہے۔ تیسری صورت نابالغی کی ہے جہاں دونوں طرف ولایت کا ہونا تقریباً متفقہ ہے، اختلاف صرف ولایت اجبار کی حد اور بالغ ہونے کے بعد اختیار ثبوت یعنی بلوغت پر نکاح ختم کرانے کے حق کی تفصیلات میں ہے۔ پاکستان کے قانونی نظام میں بالغ لڑکی کے اپنے نکاح کے اختیار کو عدالتوں نے عام طور پر تسلیم کیا ہے، جبکہ سماجی سطح پر ولی اور خاندان کی رضا کو اب بھی غالب اکثریت پسندیدہ اور خاندانی استحکام کے لیے بہتر سمجھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہی بحث کو صرف قانون تک محدود رکھنے کے بجائے خاندانی مشاورت، کفو کا لحاظ اور بزرگوں کی دعاؤں کو نکاح کا حصہ بنانا عملی حکمت بھی ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ بالغ و عاقل عورت کے نکاح میں ولی کی ضرورت پر فقہاء کے دو معروف موقف ہیں۔ احناف اسے خود اختیار سمجھتے ہیں اور ولی کی رضا کو انعقاد کی شرط نہیں بناتے، البتہ غیر کفو اور کم مہر کی صورت میں ولی کو اعتراض کا حق دیتے ہیں۔ ائمہ ثلاثہ ولی کو شرط قرار دیتے ہیں، مگر ولی کی بے جا رکاوٹ کی صورت میں ولایت عدالت کو منتقل کر دیتے ہیں اور عورت کی رضا کو دونوں طرف بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ولایت اجبار کا اصل تعلق نابالغ اور نااہل افراد سے ہے جبکہ بالغہ کے معاملے کی بحث ولایت کے استحبابی یا

شرطی ہونے کی ہے۔ طالب علم کے لیے نتیجہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں کسی ایک طرف کو قطعی غلط قرار دینے کے بجائے دونوں استدلالات کو سمجھنا اور عملی زندگی میں اہل علم و خاندان کی مشاورت کو ساتھ رکھنا ہی علمی و سماجی طور پر درست رویہ ہے۔

سوال نمبر 2: حقوق معنویہ کی خرید و فروخت کے احکام (20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ حقوق معنویہ کی خرید و فروخت کے احکام بیان کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

حقوق معنویہ ان حقوق کو کہتے ہیں جن کا تعلق کسی جسمانی چیز سے براہ راست نہیں ہوتا بلکہ انسان کی ذہنی تخلیق، شہرت یا ساکھ سے ہوتا ہے، جیسے کتاب کی اشاعتی ملکیت یعنی طبع و نشر کا حق، کسی ایجاد کا حق، کاروباری نام اور نشان تجارت یعنی ٹریڈ مارک، اور علمی و فنی تخلیقات کے حقوق۔ جدید معیشت میں ان حقوق کی قیمت کبھی کبھی جسمانی اثاثوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے: ایک مشہور برانڈ، ایک مقبول کتاب یا ایک مفید ایجاد لاکھوں کی مالیت رکھتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ حقوق شرعاً مال شمار ہوتے ہیں اور کیا ان کی خرید و فروخت جائز ہے۔ قدیم فقہ میں مال کی تعریف اور اس کی شرائط کے حوالے سے جو بحث موجود ہے اسی کی روشنی میں معاصر فقہاء نے اس سوال کا جائزہ لیا ہے۔ اس جواب میں پہلے مال اور حق کے فقہی مفہوم، پھر حقوق معنویہ کی اقسام، پھر ان کے مال ہونے یا نہ ہونے کی بحث، اور آخر میں خرید و فروخت کے احکام و شرائط بیان کیے جائیں گے۔

فقہ میں مال اور حق کا مفہوم

فقہی کتابوں میں مال عام طور پر اس چیز کو کہا گیا ہے جس کی طرف انسانی طبع میلان رکھے اور جسے وقت ضرورت کے لیے ذخیرہ کیا جا سکے۔ قدیم دور میں مال زیادہ تر جسمانی اشیا پر مشتمل ہوتا تھا، اس لیے بعض فقہاء کی تعریفوں میں جسمانی وجود پر زور دیا گیا، جبکہ احناف کے ہاں بھی مال کی تعریف میں ذخیرہ پذیری کی شرط معروف ہے۔ تاہم فقہ ہی میں ایسے حقوق بھی تسلیم شدہ ہیں جو جسمانی نہیں مگر مال کی طرح قابل تصرف ہیں، مثلاً قرض، حق شفعہ، حق مرور یعنی گزرنے کا حق، اور منافع یعنی کسی چیز سے فائدہ اٹھانے کا حق،

جن کی ملکیت اور بعض صورتوں میں ان کا تبادلہ فقہی کتابوں میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ اجارے کا پورا باب اسی اصول پر قائم ہے کہ منفعت بھی معاوضے کا محل بن سکتی ہے، حالانکہ منفعت کوئی جامد جسمانی چیز نہیں ہوتی۔ عرف بھی مال کے تعین میں بڑا کردار ادا کرتا ہے: جس چیز کو لوگ مال سمجھ کر اس کی حفاظت کریں اور اس کے بدلے قیمت دینے پر تیار ہوں وہ عملی طور پر مال کے حکم میں آ جاتی ہے۔ اسی پس منظر میں معاصر فقہاء کی اکثریت نے حقوق معنویہ کو مال یا مال کے حکم میں شمار کیا ہے، کیونکہ ان کی حفاظت قانون بھی کرتا ہے اور لوگ انہیں قیمت دے کر حاصل بھی کرتے ہیں۔

حقوق معنویہ کی اقسام

حقوق معنویہ کی پہلی قسم حق تالیف و اشاعت ہے، جس میں مصنف یا ناشر کو کتاب چھاپنے اور بیچنے کا خصوصی حق حاصل ہوتا ہے اور اس کی اجازت کے بغیر نقل کرنا اخلاقی و قانونی طور پر غلط سمجھا جاتا ہے۔ دوسری قسم حق ایجاد ہے جو کسی نئی ایجاد، فارمولے یا صنعتی ڈیزائن پر ایجاد کرنے والے کو ملتا ہے، جسے عام طور پر مخصوص مدت کے لیے قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ تیسری قسم کاروباری نام اور ٹریڈ مارک ہے، یعنی وہ نام و نشان جس کے ذریعے تاجر کی مصنوعات پہچانی جاتی ہیں اور جس سے ان کی شہرت و اعتماد جڑا ہوتا ہے۔ چوتھی قسم سافٹ ویئر، فلم، موسیقی اور اس نوعیت کی ڈیجیٹل تخلیقات کے حقوق ہیں جو جدید دور میں سب سے زیادہ زیر استعمال ہیں۔ ان سب میں مشترک بات یہ ہے کہ ان کے پیچھے کسی شخص یا ادارے کی ذہنی محنت، سرمایہ اور وقت لگا ہوتا ہے۔ جس طرح کسی محنت سے بنی جسمانی چیز کی چوری ناجائز ہے، اسی طرح قانون و شریعت کی نظر میں کسی کی ذہنی محنت کا پھل اس کی اجازت کے بغیر اٹھانا بھی خیانت کے قریب سمجھا جاتا ہے، اور یہی احساس ان حقوق کے تحفظ کی بنیاد ہے۔

جدول 2: حقوق معنویہ کی نمایاں اقسام

حق کی نوعیت	مثال	قسم
چھاپنے اور فروخت کا اختصاصی حق	کتاب، مقالہ، نصابی مواد	حق تالیف و اشاعت
مقررہ مدت تک ایجاد سے استفادے کا حق	ایجاد، فارمولا، صنعتی ڈیزائن	حق ایجاد

شہرت و پہچان سے جڑا حق	برانڈ، لوگو، دکان کا مشہور نام	ٹریڈ مارک و تجارتی نام
نقل و تقسیم پر کنٹرول کا حق	سافٹ ویئر، فلم، میڈیا مواد	ڈیجیٹل تخلیقات

کیا حقوق معنویہ مال ہیں؟ علماء کی بحث

اس مسئلے میں معاصر اہل علم کی دو بڑی آراء سامنے آتی ہیں۔ اکثریت کا موقف یہ ہے کہ یہ حقوق مال یا مال کے حکم میں ہیں، لہٰذا ان کا معاوضہ لینا، انہیں فروخت کرنا، ورثے میں منتقل کرنا اور ان کی خلاف ورزی پر تاوان کا مطالبہ کرنا درست ہے۔ اس موقف کے دلائل میں عرف کی شہادت، منافع کی ملکیت کا فقہی اصول، اور حکومت کی طرف سے ان حقوق کا قانونی تحفظ شامل ہے۔ معاصر فقہی اداروں، ازجملہ بین الاقوامی مجامع، نے بھی اسی رجحان کو تقویت دی ہے کہ طبع و نشر کے حقوق، تجارتی نام و نشان اور ایجاد کے حقوق محترم ہیں، ان میں تصرف بلا اجازت ناجائز ہے اور ان کا معاوضہ جائز ہے۔ دوسری رائے احتیاط پر مبنی ہے، جس کے مطابق مال کی قدیم تعریف کی رو سے یہ حقوق اصل مال نہیں، اس لیے ان کی مستقل خرید و فروخت کو مال کی بیع کے بجائے منفعت یا صلح کے اصولوں سے حل کرنا چاہیے۔ عملی نتیجے میں دوسری رائے کے حامل بہت سے علماء بھی عام طور پر ان حقوق کی خلاف ورزی کو درست نہیں سمجھتے اور اجازت کے بغیر کتاب چھاپنے یا نام استعمال کرنے کو غلط قرار دیتے ہیں؛ اختلاف زیادہ تر اصطلاحی درجہ بندی اور معاملے کی فنی صورت میں رہ جاتا ہے۔

خرید و فروخت کے احکام و شرائط

حقوق معنویہ کی خرید و فروخت کے احکام میں پہلا اصول ملکیت اور اختیار کا ہے: وہی شخص فروخت کر سکتا ہے جو اس حق کا مالک ہو یا اس کی طرف سے مجاز ہو، جیسے مصنف خود یا اس کا ورثہ یا جسے اس نے حق منتقل کر دیا ہو۔ دوسرا اصول حق کی وضاحت ہے: معاہدے میں یہ واضح ہونا چاہیے کہ کون سا حق منتقل ہو رہا ہے، کس مدت کے لیے، کس علاقے یا کس ذریعے تک محدود ہے، کیونکہ اشاعتی حقوق میں عرصہ، علاقہ اور زبان تک کی تقسیم عام ہے اور ابہام نزاع پیدا کرتا ہے۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ خود تخلیق کا مواد شرعاً جائز ہو؛ کسی حرام یا فحش مواد کے حقوق کا کاروبار اس مواد کی حکمرانی سے الگ نہیں ہو سکتا۔ چوتھا اصول قانونی تحفظ کی پابندی ہے: جہاں قانون ان حقوق کو تحفظ دیتا ہے وہاں

معاہدے وعہد کی پابندی بھی شرعی اصول ہے، اس لیے پیٹنٹ یا ٹریڈ مارک کی مدت اور شرائط کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ حق کی فروخت اور حق کے استعمال کی اجازت میں فرق واضح رکھا جائے، کیونکہ اجازت یعنی لائسنس میں ملکیت منتقل نہیں ہوتی بلکہ محدود استعمال کی اجازت ملتی ہے، اور دونوں کے احکام میں یہی فرق بنیادی ہے۔

ان احکام کے عملی نتائج بھی واضح ہیں۔ مصنف اپنی کتاب کے اشاعتی حقوق ناشر کو معاوضے کے عوض دے سکتا ہے اور ناشر کی طرف سے ملنے والی آمدنی حلال کمائی کے زمرے میں آئے گی۔ کسی ایجاد کا حق مقررہ شرائط کے ساتھ فروخت کرنا اس کے استعمال کا لائسنس دینا جائز سمجھا جاتا ہے۔ دکان یا کمپنی کی شہرت سمیت کاروباری نام کی منتقلی، جسے جدید قانون میں ساکھ یعنی گڈول کے ساتھ جوڑا جاتا ہے، بھی شرائط کی وضاحت کے ساتھ درست تصور کی جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی دوسرے کے نام، کتاب یا ایجاد کو اجازت کے بغیر استعمال کر کے منافع کمانا خیانت اور دوسرے کے مال میں ناحق تصرف ہے۔ ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ یہ حقوق ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتے بلکہ قانون میں ان کی مدت مقرر ہوتی ہے، خاص طور پر ایجادات میں، کیونکہ علم و فن کی عمومی ترقی کا تقاضا ہے کہ ایک مدت کے بعد ہر علم انسانی ورثہ بن جائے؛ اس توازن کو شریعت کے عمومی مصلحت کے اصول سے ہم آہنگ سمجھا جاتا ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ حقوق معنویہ ذہنی محنت اور شہرت سے پیدا ہونے والے وہ حقوق ہیں جنہیں معاصر فقہاء کی اکثریت اور فقہی اداروں نے مال یا مال کے حکم میں تسلیم کیا ہے۔ ان کی خرید و فروخت، منتقلی اور لائسنس شرائط کی وضاحت کے ساتھ جائز ہے، بشرطیکہ فروخت کرنے والا حق کا مالک ہو، حق اور اس کی مدت و حدود واضح ہوں، مواد شرعاً جائز ہو اور قانونی ضوابط کی پابندی کی جائے۔ اجازت کے بغیر کسی کی کتاب چھاپنا، نام یا ایجاد استعمال کرنا درست نہیں۔ طالب علم کے لیے اہم سبق یہ ہے کہ شریعت کے اصول جامد مثالوں تک محدود نہیں؛ مال اور حق کے بنیادی اصولوں کو عرف اور نئی صورتوں پر لاگو کرنا ہی فقہ کی زندہ روایت ہے، جس کی ایک نمایاں مثال یہی حقوق معنویہ کا مسئلہ ہے۔

سوال نمبر 3: انشورنس کی جائز و ناجائز صورتیں — تجارتی اور تعاونی انشورنس (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ انشورنس کی کون سی صورتیں شرعاً جائز ہیں اور کون سی صورتیں ناجائز ہیں؟ باہمی تعاون پر مبنی اور کمرشل انشورنس کی وضاحت کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

انشورنس جدید معاشی زندگی کا ایک اہم نظام ہے جس کا مقصد غیر یقینی نقصانات کے بوجھ کو تقسیم کرنا ہے: بہت سے لوگ تھوڑا تھوڑا حصہ ڈالتے ہیں اور جس فرد کو حادثہ پیش آتا ہے اس کی مدد اس مشترکہ نظام سے ہو جاتی ہے۔ موٹر، صحت، زندگی، جائیداد اور کاروبار سمیت بے شمار شعبے اس نظام سے جڑے ہوئے ہیں اور بعض صورتوں میں قانوناً انشورنس کرانا لازمی بھی ہوتا ہے۔ شرعی نقطہ نظر سے اس نظام پر بحث کی وجہ یہ ہے کہ اس کے عام تجارتی ڈھانچے میں سود، غرر یعنی غیر یقینی اور قمار یعنی جوئے سے ملتے جلتے عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس سوال میں پہلے انشورنس کی تعریف اور اقسام پھر محلِ یعنی کمرشل انشورنس پر شرعی اعتراضات، پھر باہمی تعاون پر مبنی انشورنس یعنی تکافل کا نظام اور اس کے جواز کی بنیاد، اور آخر میں جائز و ناجائز صورتوں کی درجہ بندی پیش کی جائے گی۔ یہ مطالعہ بھی علمی نوعیت کا ہے؛ کسی خاص پالیسی کے فیصلے میں مستند اہل علم سے رجوع کرنا چاہیے۔

انشورنس کا مفہوم اور عمومی اقسام

انشورنس کے معاہدے میں بیمہ دار یعنی پالیسی لینے والا باقاعدگی سے ایک مقررہ رقم یعنی پریمیم ادا کرتا ہے اور بیمہ کمپنی اس کے بدلے یہ ذمہ داری لیتی ہے کہ اگر مقررہ قسم کا نقصان یا حادثہ پیش آئے تو متفقہ حد تک تلافی کی جائے گی۔ انشورنس کی عمومی اقسام میں زندگی کی انشورنس، صحت کی انشورنس، گاڑی و جائیداد کی جنرل انشورنس اور ذمہ داری کی انشورنس شامل ہیں۔ ڈھانچے کے اعتبار سے اس کی دو بڑی قسمیں ہیں: تجارتی انشورنس جس میں کمپنی منافع کے لیے یہ کاروبار کرتی ہے اور پالیسی ہولڈر محض گاہک ہوتا ہے، اور تعاونی انشورنس جس میں شرکاء خود ایک مشترکہ فنڈ تشکیل دے کر ایک دوسرے کے نقصان کی تلافی کا اہتمام کرتے ہیں اور ادارہ ان کے وکیل یا منتظم کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ یہی ساختی فرق شرعی حکم میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے، جیسا کہ آگے واضح ہو گا۔

تجارتی (کمرشل) انشورنس پر شرعی اعتراضات

معاصر فقہاء کی اکثریت اور بین الاقوامی فقہی اداروں نے تجارتی انشورنس کو اس کی موجودہ عام صورت میں جائز قرار نہیں دیا، اور اس کی تین بڑی وجوہ بیان کی ہیں۔ پہلی وجہ غرر ہے: پالیسی لینے والا پریمیم تو یقینی ادا کرتا ہے مگر اس کے بدلے میں اسے کیا ملے گا، کب ملے گا اور ملے گا بھی یا نہیں، یہ سب غیر یقینی ہے؛ حادثہ نہ ہو تو پریمیم ضائع ہو جاتا ہے اور حادثہ ہو جائے تو ادا شدہ رقم سے کئی گنا زیادہ مل سکتا ہے، اس غیر یقینی کو بیع میں ممنوع غرر کی ایک بڑی صورت سمجھا گیا ہے۔ دوسری وجہ سود ہے: کمپنیاں جمع شدہ رقم سودی سرمایہ کاری میں لگاتی ہیں اور لائف انشورنس میں خاص مدت کے بعد سوسائٹی رقم کی واپسی کی صورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ تیسری وجہ قمار سے مشابہت ہے: ایک فریق کم رقم دے کر بڑی رقم کی امید لگاتا ہے اور نتیجہ اتفاقی واقعے پر منحصر رہتا ہے، جس میں ایک کی جیت دوسرے کے نقصان سے جڑی ہوتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر زندگی کی تجارتی انشورنس کو خاص طور پر ناجائز شمار کیا جاتا ہے، کیونکہ اس میں سود اور غرر دونوں نمایاں ہوتے ہیں۔ البتہ بعض معاصر اہل علم نے بعض مخصوص صورتوں، مثلاً قانونی مجبوری یا شدید سماجی ضرورت کی صورتوں میں، محدود بحث بھی کی ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

باہمی تعاون پر مبنی انشورنس (تکافل)

باہمی تعاون پر مبنی نظام کو تکافل کہا جاتا ہے، جو تعاون کے قرآنی اصول پر قائم ہے کہ نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ اس نظام میں شرکاء اپنی رقوم پر یمیم یعنی خریداری کی قیمت کے طور پر نہیں بلکہ تبرع یعنی رضاکارانہ عطیے کے طور پر مشترکہ فنڈ میں جمع کرتے ہیں، اس نیت کے ساتھ کہ جس شریک کو نقصان پہنچے اس کی مدد اسی فنڈ سے کی جائے۔ فنڈ کی ملکیت شرکاء ہی کی رہتی ہے اور منتظم ادارہ وکالہ یا مضاربہ کے اصول پر انتظامی خدمت انجام دے کر متفقہ فیس یا منافع کا حصہ لیتا ہے۔ اگر مدت کے اختتام پر فنڈ میں رقم بچ جائے تو وہ شرکاء کو واپس یا ان کے حصوں میں شامل ہوتی ہے، اور کم پڑ جائے تو نظام کے متفقہ طریقے سے اس کا انتظام ہوتا ہے۔ اس ڈھانچے میں غرر کی شکایت اس لیے کمزور ہو جاتی ہے کہ عطیے کے معاملے میں عدم یقینیت کو فقہ میں بیع کے مقابلے میں گوارہ کیا جاتا ہے، اور فنڈ سودی کاروبار کے بجائے شرعی طریقوں سے سرمایہ

کاری کرتا ہے۔اسی بنا پر معاصر فقہی اداروں اور علماء کی اکثریت نے تکافل کو جائز متبادل کے طور پر تسلیم کیا ہے اور آج پاکستان سمیت کئی ممالک میں تکافل کمپنیاں باقاعدہ کام کر رہی ہیں۔

Figure 1: Cooperative (takaful) insurance mo…



شکل 1: تعاونی تکافل کا نظام — شرکاء کے عطیات سے مشترکہ فنڈ اور نقصان کی تلافی۔

جدول 3: تجارتی انشورنس اور تکافل کا فرق

پہلو	تجارتی (کمرشل) انشورنس	تعاونی انشورنس (تکافل)
رقم کی قانونی حیثیت	پریمیم؛ کمپنی سے خریدا گیا معاہدہ	تبرع؛ مشترکہ فنڈ میں عطیہ
فنڈ کی ملکیت	کمپنی کی	شرکاء کی
ادارے کا منافع	پریمیم اور مطالبات کے فرق سے	وکالہ فیس یا مضاربہ کے حصے سے
سرمایہ کاری	عموماً سودی و روایتی	شرعی اصولوں کے مطابق
بچت (سرپلس)	کمپنی کا منافع	شرکاء کو واپس یا ان کے فنڈ میں
شرعی موقف (اکثریت)	غرر، سود و قمار کی وجہ سے ناجائز	جائز متبادل

جائز وناجائز صورتوں کی درجہ بندی

ابتدائی درجہ بندی یہ ہے کہ تجارتی لائف انشورنس اور وہ جنرل انشورنس جو کمپنی کے ساتھ منافع بخش بیع نما معاہدے کی صورت میں ہو، اکثریتی موقف کے مطابق ناجائز ہے۔ اس کے مقابلے میں تکافل کی تمام معروف صورتیں، خواہ خاندانی تکافل ہو یا جنرل تکافل، شرائط کی پابندی کے ساتھ جائز ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست کی طرف سے چلنے والے سماجی تحفظ کے نظام، مثلاً ملازمین کی فلاح کے فنڈز اور سماجی بیمہ کی وہ شکلیں جن میں شہری گاہک بن کر معاہدہ نہیں کرتا بلکہ نظام خود بخود تحفظ دیتا ہے، انہیں بہت سے علماء نے انشورنس کے تجارتی معاہدے سے الگ رکھا ہے کیونکہ ان میں بیع کا ڈھانچہ موجود نہیں ہوتا۔ چند صورتیں درمیان میں ہیں جن پر بحث ہوتی ہے: جہاں قانون کسی انشورنس کو لازمی قرار دے، مثلاً بعض ممالک میں گاڑی کی تیسری فریق کی ذمہ داری کی انشورنس، وہاں بعض علماء نے اسے اضطراری مجبوری اور دوسروں کے حقوق کے تحفظ کی بنیاد پر اس حد تک گنجائش کا قول کیا ہے جتنا قانون کا تقاضا ہے۔ اسی طرح جہاں تکافل دستیاب نہ ہو اور صحت یا خاندان کی کفالت کا سنگین مسئلہ ہو، وہاں انفرادی صورتوں میں اہل علم سے مشورے کی تاکید کی جاتی ہے۔ یہ تفصیلات بتاتی ہیں کہ مسئلہ کلی نعرے کا نہیں بلکہ ہر صورت کے ڈھانچے کو دیکھ کر فیصلہ کرنے کا ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ انشورنس کا مقصد، یعنی نقصان کے بوجھ کی باہمی تقسیم، بذات خود قابل تعریف ہے، مسئلہ اس کے ڈھانچے کا ہے۔ تجارتی انشورنس میں غرر، سود اور قمار نما عناصر کی وجہ سے اکثریت علماء و فقہی ادارے اسے جائز نہیں سمجھتے، خاص طور پر لائف انشورنس کو۔ باہمی تعاون پر مبنی تکافل میں تبرع کی بنیاد، شرکاء کی ملکیت اور شرعی سرمایہ کاری کی وجہ سے وہ اعتراضات دور ہو جاتے ہیں، اس لیے یہ جائز متبادل ہے۔ سماجی تحفظ کے سرکاری نظام اس بحث سے الگ سمجھے جاتے ہیں اور قانونی لازمی صورتوں میں بعض علماء نے محدود گنجائش کا قول کیا ہے۔ طالب علم کے لیے نتیجہ یہ ہے کہ جدید اداروں کے شرعی جائزے میں نام نہیں بلکہ معاہدے کی اصل ساخت دیکھنی چاہیے، اور کسی عملی پالیسی سے پہلے مستند اہل علم کی رہنمائی لینی چاہیے۔

سوال نمبر 4: حدود و قصاص میں غائب کے خلاف فیصلہ، دباؤ کے تحت اقرار اور وعدہ معاف گواہ (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ حدود و قصاص میں غائب کے خلاف فیصلے، دباؤ کے تحت اقرار، اور وعدہ معاف گواہ کی شرعی حیثیت بیان کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

اسلامی عدالتی نظام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سزا کے معاملے میں ثبوت کے معیار کو نہایت بلند رکھا گیا ہے، خاص طور پر حدود و قصاص جیسے سنگین معاملات میں، جن میں انسانی جان، جسم اور عزت براہ راست متاثر ہوتی ہے۔ اسلامی فقہ کا مشہور اصول ہے کہ حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں، یعنی جہاں ثبوت میں کوئی معقول شک پیدا ہو جائے وہاں حد جاری نہیں ہوتی۔ اس سوال میں تین متعلقہ مسائل کا جائزہ لیا جائے گا: کیا غائب ملزم کے خلاف اس کی غیر موجودگی میں فیصلہ دیا جا سکتا ہے، دباؤ یا زبردستی کے تحت کیے گئے اقرار کی شرعی حیثیت کیا ہے، اور وعدہ معاف گواہ یعنی وہ گواہ جسے ریاست معافی یا رعایت کا وعدہ کر کے پیش کرتی ہے، اس کی گواہی کا کیا مقام ہے۔ یہ جواب خالص تعلیمی مطالعہ ہے؛ کسی اصل مقدمے میں ان اصولوں کا اطلاق متعلقہ عدالت اور اس کے مجاز طریقہ کار سے ہوتا ہے، فرد یا طالب علم اپنے طور پر نہ کوئی فیصلہ کر سکتا ہے اور نہ اسے کرنا چاہیے۔

بنیادی اصول: ثبوت کا اعلیٰ معیار اور شبہ کا اصول

حدود میں ثبوت کے طریقے متعین اور محدود رکھے گئے ہیں: یا تو آزادانہ اور اختیار کے ساتھ کیا گیا اقرار ہو، یا معتبر گواہوں کی شہادت جو مطلوبہ تعداد اور شرائط کے مطابق ہو۔ قصاص کا تعلق جان و جسم سے ہے؛ اس میں میت کے اولیا کا حق بھی شامل ہوتا ہے لیکن ثبوت کا معیار بھی سخت رکھا گیا ہے۔ ان دونوں ابواب میں فقہاء نے ملزم کے حقوق کی حفاظت کو خاص اہمیت دی ہے: ملزم کو صفائی کا موقع ملنا، گواہوں کو پرکھنا، اقرار سے رجوع کی گنجائش اور شبہ کی صورت میں سزا کا رک جانا اسی حفاظت کے مظاہر ہیں۔ اس پس منظر کی وجہ یہ ہے کہ ایک بے گناہ کو سزا دینا نظام عدل کے لیے اس سے کہیں زیادہ تباہ کن سمجھا گیا ہے جتنا کسی مشکوک ملزم کا وقتی طور پر چھوٹ جانا، کیونکہ دنیا کی سزا کا ازالہ ممکن نہیں ہوتا جبکہ اخروی حساب بہر حال قائم ہے۔ یہی اصولی پس منظر آگے کے تینوں مسائل کے جواب کی بنیاد ہے۔

غائب کے خلاف فیصلہ

غائب کے خلاف فیصلے سے مراد یہ ہے کہ ملزم عدالت کے سامنے موجود نہ ہو اور کارروائی اس کی غیر موجودگی میں مکمل کر کے سزا سنائی جائے۔ فقہی اصول کے مطابق عدالتی فیصلے کی بنیادی شرائط میں فریق کا سامنا، دعویٰ سننا اور صفائی کا موقع شامل ہے، اس لیے حدود و قصاص جیسے سنگین مقدمات میں غائب کے خلاف حد یا قصاص کا فیصلہ اور اس کا نفاذ فقہاء کے نزدیک درست نہیں سمجھا جاتا۔ وجوہ واضح ہیں: ملزم موجود ہو تو اقرار سے رجوع کر سکتا ہے، گواہوں پر جرح کر سکتا ہے اور شبہ پیدا کرنے والی بات پیش کر سکتا ہے، جبکہ اس کی غیر موجودگی میں یہ سب دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ البتہ کارروائی کے بعض ابتدائی مراحل، مثلاً ملزم کی تلاش، اشتہار، اس کے مال کی حفاظت اور گواہیاں ریکارڈ کرنا تاکہ ثبوت ضائع نہ ہو، ان جیسے انتظامی اقدامات کو حدود کے نفاذ سے الگ دیکھا جاتا ہے۔ مالی حقوق اور دیگر خفیف نوعیت کے معاملات میں بعض فقہاء نے غائب کے خلاف فیصلے کی کچھ صورتوں کو انتظامی ضرورت کے تحت دیکھا بھی ہے، لیکن جان و بدن اور حدود کے فیصلے میں اصل یہ ہے کہ گرفتاری اور حاضری کے بغیر سزا نافذ نہیں ہوتی۔ جدید قوانین میں مفرور ملزم کے خلاف جو کارروائی ہوتی ہے اسے بھی عام طور پر ابتدائی اور مشروط درجہ دیا جاتا ہے اور سزا کا اصل نفاذ گرفتاری سے جڑا ہوتا ہے، جو اس فقہی احتیاط سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہے۔

دباؤ کے تحت اقرار کی حیثیت

اقرار کا مطلب اپنے خلاف کسی حق کا خود اعتراف کرنا ہے۔ حدود میں اقرار کو ثبوت کا ذریعہ اس وقت تسلیم کیا جاتا ہے جب وہ مکمل اختیار، ہوش مندی اور آزادی کے ساتھ کیا گیا ہو۔ فقہ کا متفقہ اصول ہے کہ جبر و اکراہ کے تحت حاصل کیا گیا اقرار شرعاً معتبر نہیں ہوتا، کیونکہ اقرار کی حجت اسی بنیاد پر ہے کہ انسان اپنی مرضی سے اپنے خلاف سچ بول رہا ہے؛ دھمکی، مار پیٹ، قید کی سختی یا کسی بڑی مصیبت کے خوف سے کہا گیا جملہ سچ کی علامت نہیں رہتا بلکہ مصیبت سے بچنے کی کوشش بن جاتا ہے۔ اسی لیے فقہاء نے حدود میں اقرار کرنے والے کی عقل، بلوغ اور اختیار کو شرط قرار دیا اور ساتھ یہ بھی اصول بنایا کہ حدود میں اقرار سے رجوع کرنا ممکن ہے، بلکہ بعض صورتوں میں رجوع کی تلقین کو بھی درست سمجھا گیا، کیونکہ مقصد سزا کی بھرمار نہیں بلکہ یقینی جرم پر ہی حد کا قیام ہے۔ قصاص میں بھی دباؤ کے اقرار کو قتل جیسے سنگین جرم کے ثبوت کے لیے کافی نہیں سمجھا جاتا

جب تک آزادانہ تصدیق اور دیگر قرائن موجود نہ ہوں۔ اس اصول کی جدید اہمیت یہ ہے کہ تفتیش میں زبردستی سے اعتراف لینے کے طریقوں کو فقہ، اخلاق اور جدید قانون تینوں مسترد کرتے ہیں، اور جھوٹا اعتراف نہ صرف ملزم کے لیے ظلم ہے بلکہ اصل مجرم کے بچ نکلنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

وعدہ معاف گواہ کی شرعی حیثیت

وعدہ معاف گواہ سے مراد وہ شخص ہے جو خود بھی کسی جرم میں شامل یا اس کا ساتھی رہا ہو، مگر ریاست اسے اس وعدے پر گواہ بنا کر پیش کرتی ہے کہ سچ بتانے کی صورت میں اسے معافی یا سزا میں رعایت ملے گی؛ جدید قانونی اصطلاح میں اسے اپروور کہا جاتا ہے۔ شرعی جائزے میں اس گواہی کو انتہائی احتیاط سے دیکھا جاتا ہے، کیونکہ گواہی کی بنیادی شرائط میں گواہ کا عادل اور غیر جانبدار ہونا شامل ہے، جبکہ وعدہ معاف گواہ کے سامنے ذاتی مفاد موجود ہوتا ہے جو اس کے بیان کو متاثر کر سکتا ہے: وہ خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دوسروں پر الزام بڑھا بھی سکتا ہے۔ اس لیے فقہی اصول کے مطابق صرف ایسے گواہ کے بیان پر، تصدیق کے بغیر، حدیا قصاص جیسی سزا قائم نہیں کی جا سکتی۔ اس کے بیان سے تفتیش کو سمت مل سکتی ہے اور دیگر آزاد شواہد اکٹھے کیے جا سکتے ہیں، مگر سزا کا مدار مستقل، معتبر اور بے داغ ثبوت پر ہو گا۔ بعض قانونی نظاموں میں اس گواہی کو اضافی تصدیق کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے اور تعزیری معاملات میں اس سے کام لیا جاتا ہے، لیکن حدود و قصاص کے اعلیٰ معیار میں اسے حتمی ثبوت کا درجہ دینا شرعی احتیاط کے خلاف ہے۔ گواہ کے اپنے جرم کی معافی کا وعدہ بھی عدالت و ریاست کے دائرے میں رہ کر ہی قابل قبول ہو سکتا ہے، حقوق العباد خصوصاً قصاص میں ورثا کے حقوق کسی وعدے سے ختم نہیں کیے جا سکتے۔

جدول 4: تینوں مسائل میں شرعی حیثیت کا خلاصہ

مسئلہ	شرعی اصول	حدود و قصاص میں حیثیت
غائب کے خلاف فیصلہ	سماعت و صفائی کا موقع بنیادی حق	حد و قصاص کا نفاذ حاضری کے بغیر درست نہیں
دباؤ کے تحت اقرار	اقرار آزادی و اختیار سے ہی حجت ہے	جبر کا اقرار غیر معتبر؛ رجوع کی بھی گنجائش

تنہابنیاد پر حدو قصاص قائم نہیں؛ تصدیق لازم	گواہ کا عادل و غیر جانبدار ہونا شرط	وعدہ معاف گواہ

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ حدود و قصاص میں شرعی نظام نے ثبوت کے معیار کو بلند ترین سطح پر رکھا ہے اور ہر وہ طریقہ جو ثبوت میں شبہ پیدا کرے، سزا کے راستے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ غائب کے خلاف حدو قصاص کا فیصلہ و نفاذ درست نہیں، کیونکہ سماعت مدعیٰ کا حق ساقط ہو جاتا ہے۔ دباؤ کے تحت اقرار شرعاً غیر معتبر ہے، کیونکہ اقرار کی حجت آزادی پر قائم ہے اور حدود میں رجوع کی گنجائش بھی موجود ہے۔ وعدہ معاف گواہ کی گواہی مفاد سے جڑے ہونے کی وجہ سے مشکوک ہوتی ہے، اس لیے اس پر تنہا حدو قصاص قائم نہیں ہوتا اور آزاد تصدیق لازم ہے۔ یہ اصول محض فقہی تکنیک نہیں بلکہ انسانی جان و عزت کے تحفظ کا نظام ہیں۔ ایک بار پھر واضح رہے کہ ان اصولوں کا اطلاق عدالتوں کا کام ہے؛ یہ جواب صرف تعلیمی فہم کے لیے ہے۔

سوال نمبر 5: قضاء، فتویٰ، تحکیم، حسبہ اور ولایت مظالم کا فرق (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ قضاء اور فتویٰ، تحکیم، حسبہ اور ولایتِ مظالم کے درمیان فرق واضح کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

اسلامی نظام میں تنازعات کے حل اور حقوق کے تحفظ کے لیے کئی ادارے موجود رہے ہیں، جن میں سے بعض کے نام آج بھی رائج ہیں لیکن ان کے دائرے اکثر خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ قضاء عدالتی فیصلے کا نظام ہے، فتویٰ شرعی رہنمائی کا علمی عمل ہے، تحکیم فریقین کی رضامندی سے ثالثی کا طریقہ ہے، حسبہ عوامی نظم و اخلاق کی نگرانی کا ادارہ ہے اور ولایت مظالم حکمران یا اس کے مقرر کردہ عہدے دار کے سامنے ظلم کی دادرسی کا خصوصی نظام ہے۔ ان پانچوں کا مقصد عدل کی خدمت ہے، مگر ان کا طریقہ، دائرہ اختیار اور

فیصلے کی قوت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔اس سوال میں پہلے ہر ادارے کی تعریف و خصوصیات بیان ہوں گی، پھر ان کے باہمی فرق کو جدول اور تفصیل سے واضح کیا جائے گا،اور آخر میں ان کی جدید صورتوں کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔

قضاء: تعریف و خصوصیات

قضاء سے مراد حکومت کی طرف سے مقرر کردہ قاضی کا وہ فیصلہ ہے جو تنازعے کے فریقین پر لازماً نافذ ہوتا ہے۔ قاضی دعویٰ سنتا ہے، ثبوت کا جائزہ لیتا ہے اور قانون شریعت کے مطابق فیصلہ سناتا ہے، جسے ریاستی طاقت نافذ کرتی ہے۔ قضاء کی خصوصیات میں تقرری حکومت کی طرف سے ہونا، فریقین کی حاضری و سماعت، شہادت و دلائل کی باقاعدہ جانچ اور فیصلے کا حتمی و لازم ہونا شامل ہیں۔ قاضی کے لیے علم، عدل، دیانت اور فیصلہ سازی کی صلاحیت کی شرائط فقہ میں تفصیل سے بیان ہوئی ہیں، کیونکہ اس کے فیصلے سے لوگوں کے جان و مال کے تنازعات طے ہوتے ہیں۔ قضاء کا دائرہ دیوانی، خاندانی اور فوجداری سب معاملات تک پھیلا ہوا ہے اور حدود و قصاص جیسے سنگین فیصلے بھی اسی ادارے کے دائرے میں آتے ہیں، جن کے ثبوت کے سخت معیارات کا ذکر پچھلے سوال میں گزر چکا ہے۔ جدید ریاست میں عدلیہ کا نظام دراصل قضاء ہی کی توسیع یافتہ صورت ہے۔

فتویٰ: تعریف و قضاء سے فرق

فتویٰ مفتی کی طرف سے شرعی حکم کی اطلاع ہے: جب کوئی شخص یا ادارہ کسی مسئلے کا شرعی حکم پوچھتا ہے تو مفتی دلائل کی روشنی میں یہ بتاتا ہے کہ شریعت کی رو سے اس مسئلے کا حکم یہ ہے۔ فتویٰ اور قضاء میں بنیادی فرق یہ ہے کہ فتویٰ لازم نہیں ہوتا؛ پوچھنے والا اس پر عمل کرے یا کسی دوسرے اہل علم سے رجوع کرے، مفتی کے پاس فیصلہ نافذ کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ قاضی واقعات کا فیصلہ ثبوت سن کر کرتا ہے جبکہ مفتی عموماً پوچھنے والے کے بیان کردہ فرضی یا واقعی مسئلے کا حکم بتاتا ہے؛ اگر صورت حال مختلف نکلے تو فتویٰ بھی اسی کے مطابق بدل سکتا ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ فتویٰ کے لیے ریاستی تقرری ضروری نہیں، اصل شرط علمی اہلیت ہے، جبکہ قاضی کی تقرری ریاست سے ہوتی ہے۔ اس کے باوجود فتویٰ کی سماجی اہمیت بہت بڑی ہے، کیونکہ عام مسلمانوں کی دینی رہنمائی، مساجد و مدارس کی زندگی اور نجی معاملات کا حل زیادہ تر فتوے سے ہی ہوتا ہے،اور یہی وجہ ہے کہ افتاء کے لیے علمی رسوخ، تقویٰ اور حالات کی سمجھ کو لازم سمجھا گیا ہے۔

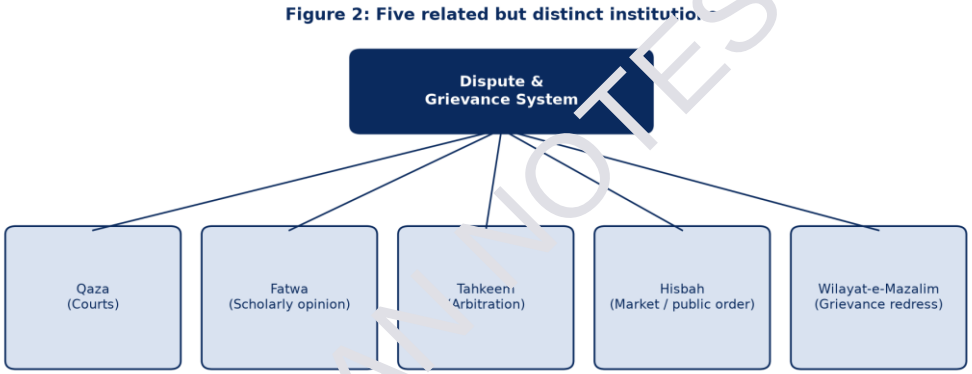
تحکیم: تعریف و خصوصیات

تحکیم سے مراد یہ ہے کہ دو فریق اپنے تنازعے کے حل کے لیے کسی تیسرے شخص یا مجلس کو حکم یعنی ثالث مقرر کر لیں اور اس کے فیصلہ کو قبول کرنے کا عزم کریں۔ یہ نظام قرآن مجید میں خاندانی جھگڑے کے حل کے لیے صراحت کے ساتھ ذکر ہو چکا ہے، جہاں میاں بیوی کے اختلاف میں دونوں خاندانوں سے حکم مقرر کرنے کی ہدایت ہے۔ تحکیم کی پہلی خصوصیت رضامندی ہے: یہ فریقین کی مرضی سے شروع ہوتی ہے، اس لیے یہ عدالت کا بوجھ کم کرنے اور رشتوں کی خرابی روکنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ دوسری خصوصیت لچک ہے: طریقہ کار نسبتاً سادہ، نجی اور تیز ہوتا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ حکم کے فیصلے کی قوت بنیادی طور پر فریقین کے عہد اور بعض قانونی نظاموں میں عدالت کی توثیق سے نافذ ہوتی ہے۔ البتہ حدود و قصاص جیسے وہ معاملات جو اللہ کے حقوق یا سنگین جرائم سے تعلق رکھتے ہیں، عام تحکیم کے دائرے سے باہر سمجھے جاتے ہیں، کیونکہ ان میں نجی صلح کا اختیار ہر صورت موجود نہیں ہوتا۔ جدید دور میں کاروباری ثالثی اور خاندانی کونسلنگ اسی تحکیم کی نمایاں جدید صورتیں ہیں۔

حسبہ اور ولایت مظالم

حسبہ وہ ادارہ ہے جس کا کام عوامی زندگی میں نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ہے، خاص طور پر ان امور میں جہاں کوئی فرد مدعی بن کر عدالت نہیں جاتا۔ محتسب بازاروں کی نگرانی کرتا تھا: ناپ تول کی درستگی، ملاوٹ کی روک تھام، قیمتوں کی بے جا زیادتی، عوامی راستوں میں رکاوٹ اور دھوکا دہی جیسے معاملات اس کے دائرے میں آتے تھے۔ حسبہ کا فرق قضاء سے یہ ہے کہ محتسب مدعی کا انتظار نہیں کرتا بلکہ ظاہری عوامی خلل پر خود کارروائی کرتا ہے، البتہ اس کے اختیارات بھی محدود ہوتے ہیں: وہ بڑے جرائم کی سزا نہیں دیتا بلکہ فوری اصلاح، تنبیہ اور معاملہ عدالت کی طرف بھیجنے تک کا کام کرتا ہے۔ جدید دور میں مارکیٹ کمیٹیاں، صارف تحفظ کے ادارے اور میونسپل نگرانی کے نظام اسی کے مماثل سمجھے جا سکتے ہیں۔ ولایت مظالم اس سے الگ ادارہ ہے: یہ وہ خصوصی سماعت ہے جہاں حکمران یا اس کا مقرر کردہ عہدہ دار ان شکایات کو سنتا ہے جو عام عدالتوں میں مشکل سے حل ہوں، خاص طور پر جہاں ظلم کرنے والا خود سرکاری عہدے دار یا طاقتور شخص ہو۔ اس ادارے میں فریق کو براہ راست بڑے حاکم تک رسائی ملتی تھی اور فیصلہ

فوری اور پر اثر ہوتا تھا۔ اس کی جدید مماثل صورتیں محتسب اعلیٰ یعنی اومبڈزمین اور شکایات سیل جیسے ادارے ہیں، جبکہ بعض مسلم ریاستوں میں اسی نام سے باقاعدہ ادارے بھی رہے ہیں۔



شکل 2: عدل و دادرسی کے پانچ ادارے — مقصد ایک، طریقہ و دائرہ الگ۔

جدول 5: قضاء، فتویٰ، تحکیم، حسبہ اور ولایت مظالم کا موازنہ

ادارہ	تعریف	فیصلے کی قوت	دائرہ
قضاء	مقرر قاضی کا ثبوت سن کر فیصلہ	لازم و نافذ بہ قوت ریاست	تمام تنازعات و مقدمات
فتویٰ	مفتی کا شرعی حکم بتانا	رہنمائی؛ قانونی الزام نہیں	دینی و شرعی مسائل
تحکیم	فریقین کے مقرر ثالث کا فیصلہ	باہمی عہد و قانونی توثیق سے نافذ	قابل صلح نجی تنازعات
حسبہ	عوامی نظم و بازار کی نگرانی	فوری اصلاح و تنبیہ؛ سزا عدالت سے	عوامی و بازاری معاملات
ولایت مظالم	حاکم یا مندوب کی خصوصی دادرسی	براہ راست و فوری نافذ	طاقتور و عہدے داروں کے خلاف شکایات

باہمی فرق کا خلاصہ اور جدید اہمیت

ان پانچوں اداروں کا بنیادی فرق چار نکات میں سمویا جا سکتا ہے۔ پہلا نکتہ آغاز کا ہے: قضاء دعویٰ دائر ہونے سے، فتویٰ سوال پوچھنے سے، تحکیم فریقین کی رضامندی سے، حسبہ محتسب کی خود کار نگرانی سے اور ولایت مظالم مظلوم کی براہ راست شکایت سے شروع ہوتی ہے۔ دوسرا نکتہ فیصلے کی قوت کا ہے: قضاء کا فیصلہ لازم و عدالتی ہوتا ہے، ولایت مظالم کا فیصلہ انتظامی عدل کی وجہ سے فوری نافذ ہوتا ہے، تحکیم کا فیصلہ عہد و تشریح پر قائم رہتا ہے، حسبہ کی کارروائی اصلاحی حد تک محدود ہوتی ہے اور فتویٰ محض علمی رہنمائی ہے۔ تیسرا نکتہ دائرے کا ہے: حدود و قصاص صرف قضاء کے دائرے میں ہیں، قابل صلح معاملات تحکیم میں، ظاہری عوامی خلل حسبہ میں اور طاقتور کے ظلم کی شکایت ولایت مظالم میں جا سکتی ہے۔ چوتھا نکتہ عہدے دار کی حیثیت کا ہے: قاضی مقرر عدالتی منصب دار ہے، مفتی اہل علم ہے، حکم فریقین کا چنا ہوا ثالث ہے، محتسب انتظامی نگران ہے اور ناظر مظالم حکمران یا اس کا خصوصی نمائندہ ہے۔ آج کے نظام میں یہ تقسیم پوری طرح ختم نہیں ہوئی بلکہ نئی صورتوں میں زندہ ہے۔ عدالتیں، دار الافتاء، ثالثی مراکز، صارف تحفظ ادارے اور اومبڈزمین اسی قدیم تقسیم کی جدید شکلیں ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام عدل نے مختلف نوعیت کے مسائل کے لیے الگ الگ دروازے رکھے تھے تاکہ ہر مظلوم کو اس کی صورت کے مناسب فورم میسر آئے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ قضاء، فتویٰ، تحکیم، حسبہ اور ولایت مظالم عدل کے پانچ الگ ادارے ہیں۔ قضاء ثبوت سن کر لازم و حتمی عدالتی فیصلہ دیتا ہے، فتویٰ بغیر کسی قانونی الزام کے شرعی حکم کی رہنمائی کرتا ہے، تحکیم فریقین کی رضامندی سے منتخب ثالث کے ذریعے تنازعہ ختم کرتی ہے، حسبہ عوامی نظم اور بازار کی نگرانی کر کے ظاہری خلل کو روکتا ہے، اور ولایت مظالم طاقتوروں کے خلاف مظلوم کی براہ راست دادرسی کا خصوصی نظام ہے۔ ان میں فرق کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ ہر مسئلے کا درست فورم الگ ہوتا ہے: شرعی حکم جاننا فتوے کا کام ہے، فیصلہ نافذ کرنا عدالت کا، صلح تحکیم سے، عوامی خلل کی اصلاح حسبہ سے اور عہدے دار کے ظلم کی شکایت مظالم کے ادارے سے وابستہ ہے۔ اسی تقسیم میں اسلامی نظام عدل کی وہ وسعت اور باریک بینی ظاہر ہوتی ہے جو آج کے قانونی نظاموں میں بھی رہنما اصول فراہم کرتی ہے۔